ہوں کہ اور کسی بات میں تو مذہب کی پروا نہیں کی جاتی اور سارا مذہبی محبت کے دکھاوے کے طریقہ پر ہی اظہار کیا جا رہا ہے تو مجھے شک ہوتا ہے کہ اس کا مطلب کچھ اور تو نہیں۔

جان سیوک: تم نے کس بات میں مجھے مذہب کے خلاف عمل کرتے دیکھا؟

پربھو سیوک: سینکڑوں ہی باتیں ہیں۔ ایک ہو تو کہوں۔

جان سیوک: نہیں ایک ہی بتلاؤ۔

پربھو سیوک: اس بے کس اندھے کی زمین پر قبضہ کرنے کے لیے آپ جن ذرائع سے کام لے رہے ہیں کیا وہ مذہب کے مطابق ہیں؟ مذہب کا خاتمہ وہیں ہو گیا جب اس نے کہہ دیا کہ میں اپنی زمین کو کسی طرح بھی نہ دوں گا۔ اب قانون حکمت اور دھمکیوں سے اپنا مطلب نکالنا آپ کو مذہب کے موافق معلوم ہوتا ہو تو ہو۔ مجھے تو وہ سراسر لامذہبی اور نامنصفی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

جان سیوک: تم اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ میں تم سے حجت نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے جا کر ٹھنڈے ہو آؤ۔ پھر میں تمہیں اس کا جواب دوں گا۔

پربھو سیوک غصہ سے بھرا ہوا اپنے کمرہ میں آیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ یہاں تک تو اس کا ستیاگرہ محض لفظی تھا، اب اس کے عملی ہونے کا موقع آ گیا، لیکن عمل کی طاقت اس کے دل میں بالکل نہ تھی۔ اس جھنجھلاہٹ کی حالت میں وہ کبھی ایک کوٹ پہنتا، کبھی اس کو اتار کر دوسرا پہنتا۔ کبھی کمرہ کے باہر چلا جاتا۔ کبھی اندر آ جاتا۔ اسی اثنا میں مسٹر سیوک آ کر بیٹھ گئے اور متانت آمیز لہجے میں بولے۔ ''پربھو! آج تمہارا جوش دیکھ کر مجھ کو جس قدر رنج ہوا ہے، اس سے کہیں زیادہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے۔ مجھے اب تک تمہاری دانائی پر اعتماد تھا۔ لیکن اب وہ اعتماد جاتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ تم زندگی اور مذہب کے تعلق کو خوب سمجھتے ہو، لیکن اب معلوم ہوا کہ صوفی اور اپنی ماں کی طرح تم بھی وہم میں مبتلا ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اور مجھ سے اور ہزاروں اشخاص

جو روز گر جا جاتے ہیں، بھجن گاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے خدا کی عبادت کرتے ہیں، کیا وہ واقعی مذہبی محبت میں ڈوبے ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر اب تک تمہیں نہیں معلوم ہے تو اب معلوم ہو جانا چاہیے کہ مذہب صرف خود غرضی کا نام ہے۔ ممکن ہے تمہیں یسوع پر اعتقاد ہو۔ شاید تم انہیں خدا کا بیٹا یا کم از کم مہاتما سمجھتے ہو۔ پر مجھے تو اس قدر یقین نہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے خوشیوں کا راگ الاپتا پھرتا ہے۔ وہ بھی اتنا ہی بے لوث، اتنا ہی منکسر مزاج اور اتنا ہی مذہب کا دلدادہ ہے، لیکن اس قدر بدظنی ہونے پر بھی میں اتوار کو سو کام چھوڑ کر گرجا ضرور جاتا ہوں۔ نہ جانے سے اپنی جماعت میں بے وقعتی ہوگی۔ اس کا میرے کاروبار پر برا اثر پڑے گا۔ پھر اپنے ہی گھر میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی۔ میں صرف تمہاری ماں کی خاطر سے اپنے اوپر یہ ظلم کرتا ہوں اور تم سے بھی میرا یہی کہنا ہے کہ بے جا ضد سے کام نہ لو۔ تمہاری ماں غصہ کے نہیں بلکہ رحم کے قابل ہے۔ بولو تمہیں کچھ کہنا ہے؟''

پربھو سیوک: جی نہیں۔

جان سیوک: اب تو پھر اتنی شرارت نہ کرو گے؟

پربھو سیوک نے مسکرا کر کہا۔ ''جی نہیں۔''

(6)

مذہبی خوف میں جہاں بہت سی بھلائیاں ہیں، وہاں ایک برائی بھی ہے۔ اس میں سادگی ہوتی ہے۔ فریبوں کا داؤں اس پر آسانی سے چل جاتا ہے۔ مذہب سے ڈرنے والا آدمی منطقی نہیں ہوتا۔ اس کی بحثی طاقت سست پڑ جاتی ہے۔ طاہر علی نے جب سے اپنی دونوں سوتیلی ماؤں کی باتیں سنی تھیں، ان کا دل بہت زیادہ بے چین ہو رہا تھا۔ بار بار خدا سے دعا مانگتے تھے۔ آئینی کتب سے اپنے شکوک رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دن تو کسی طرح گزرا۔ شام ہوتے ہی وہ مسٹر جان سیوک کے پاس پہنچے اور نہایت عاجزانہ لہجہ میں بولے۔ ''حضور کی خدمت میں اس وقت ایک

خاص عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ ارشاد ہو تو کہوں۔''

جان سیوک: ہاں ہاں کہیے۔ کوئی نئی بات ہے کیا؟

طاہر: حضور اس اندھے کی زمین لینے کا خیال ترک کر دیں تو عین مناسب ہے۔ ہزاروں دقتیں ہیں۔ تنہا سور داس ہی نہیں۔ سارا محلّہ مخالفت پر آمادہ ہے۔ خصوصاً نایک رام پنڈا بہت ہی بگڑا ہوا ہے۔ وہ بڑا خوف ناک آدمی ہے۔ جانے کتنی بار فوجداریاں کر چکا ہے۔ اگر یہ سب دقتیں کسی طرح دور ہو جائیں تو بھی آپ سے یہی استدعا کروں گا کہ اس کے بجائے کسی دوسری زمین کی فکر کیجیے۔

جان سیوک: یہ کیوں؟

طاہر: حضور! یہ کارِ عذاب ہے۔ صدہا آدمیوں کا کام اس زمین سے نکلتا ہے۔ سب کی گائیں وہیں چرتی ہیں۔ براتیں ٹھہرتی ہیں۔ پلیگ کے ایام میں لوگ وہیں جھونپڑے ڈالتے ہیں۔ وہ زمین نکل گئی تو سارے محلّہ کو تکلیف ہوگی اور لوگ دل میں ہمیں سینکڑوں بددعائیں دیں گے۔ اس کا عذاب ضرور پڑے گا۔

جان سیوک: (ہنس کر) عذاب تو میری گردن پر پڑے گا نا؟ میں اس کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔

طاہر: حضور! میں بھی تو آپ ہی کے دامن سے وابستہ ہوں۔ میں اس عذاب سے کب بچ سکتا ہوں۔ بلکہ محلّہ والے تو مجھی کو باغی سمجھتے ہیں۔ حضور تو یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں تو آٹھوں پہر ان کی آنکھوں کے سامنے رہوں گا۔ ہر وقت ان کی نظروں میں کھٹکتا رہوں گا۔ عورتیں بھی راہ چلتے دو چار کھری کھوٹی سنا دیا کریں گی۔ عیال دار آدمی ہوں۔ خدا جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے۔ آخر شہر کے مضافات میں اور زمینیں تو مل سکتی ہیں۔

مذہبی خوف مادہ پرستوں کی نظر میں مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ خصوصاً ایک جوان شخص میں اس کا ہونا تو ناقابلِ عفو سمجھا جاتا ہے۔ جان سیوک نے بناوٹی غصہ دکھلاتے

ہوئے کہا۔ ''میرے بھی تو بال بچے ہیں۔ جب میں نہیں ڈرتا تو آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اپنے بال بچے پیارے نہیں یا میں خدا سے نہیں ڈرتا؟ ''

طاہر: آپ صاحب اقبال ہیں۔ آپ کو عذاب کا خوف نہیں۔ اقبال مندوں سے عذاب بھی ڈرتا ہے۔ خدا کا قہر غریبوں ہی پر نازل ہوتا ہے۔

جان سیوک: اس نئے مذہبی اصول کے بانی شاید آپ ہی ہوں گے، کیونکہ میں نے آج تک کبھی نہیں سنا کہ اقبال مندی سے قہر ایزدی بھی ڈرتا ہے بلکہ ہماری مذہبی کتب میں تو اہل ثروت کے لیے بہشت کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا ہے۔

طاہر: حضور مجھے اس جھگڑے سے دور ہی رکھیں تو بہتر۔

جان سیوک: آج آپ کو اس جھگڑے سے دور رکھوں۔ کل آپ کو یہ خبط ہو کہ جانوروں کو ہلاک کرنے سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ آپ مجھے کھالوں کی خریداری سے دور رکھیں تو میں آپ کو کن کن باتوں سے دور رکھوں گا اور کہاں کہاں قہر ایزدی سے آپ کی حفاظت کروں گا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ آپ کو اپنے ہی سے دور رکھوں۔ میرے یہاں رہ کر آپ کو قہر ایزدی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

مسز سیوک: جب آپ کو قہر ایزدی کا اتنا خوف ہے تو آپ سے ہمارا کام نہیں ہو سکتا۔

طاہر: مجھے حضور کی خدمت سے انکار تھوڑا ہی ہے۔ میں تو صرف.....

مسز سیوک: آپ کو ہمارے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ خواہ اس سے آپ کا خدا خوش ہو یا ناخوش۔ ہم اپنے کاموں میں آپ کے خدا کو دست اندازی نہ کرنے دیں گے۔

طاہر علی مایوس ہو گئے۔ دل کو سمجھانے لگے۔ خدا رحیم ہے۔ کیا وہ دیکھتا نہیں ہے کہ میں کیسی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ میرا اس میں کیا بس ہے۔ اگر مالک کے

احکام کی تعمیل نہ کروں تو کنبہ کی پرورش کیسے ہو۔ برسوں تک خاک چھاننے کے بعد تو یہ مستقل ملازمت ملی ہے۔ اسے چھوڑوں تو پھر اسی طرح کوچہ گردی اختیار کرنی ہو گی۔ ابھی کچھ اور نہیں ہے تو روٹی دال کا سہارا تو ہے۔ خانہ داری و فکر ضمیر کی آزادی کے لیے مہلک ہے۔

طاہر علی کو لاجواب ہو جانا پڑا۔ بے چارے اپنی بیوی کے سارے گہنے بیچ کر کھا چکے تھے۔ اب ایک چھلا بھی نہ تھا۔ ماہر علی انگریزی پڑھتا تھا۔ اس کے لیے اچھے کپڑے بنوانے پڑتے۔ ماہ بماہ فیس دینی پڑتی۔ طاہر علی اور جابر علی اردو مدرسہ میں پڑھتے تھے، لیکن ان کی والدہ روز ہی جان کھایا کرتی تھی کہ انہیں بھی انگریزی مدرسہ میں بھرتی کرا بھائیوں کی ناز برداری پر ان کی ساری ضرورتیں قربان تھیں۔ پاجامہ میں اتنے پیوند لگ جاتے کہ کپڑے کی اصل شکل ہی چھپ جاتی تھی۔ نئے جوتے پہننا تو شاید ان پانچ برسوں میں انہیں نصیب ہی نہیں ہوا۔ ماہر علی کے پرانے جوتوں پر قناعت کرنی پڑتی تھی۔ خوش نصیبی سے ماہر علی کے پیر بڑے تھے۔ حتی الامکان وہ اپنے بھائیوں کو ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے، لیکن کبھی ہاتھ تنگ رہنے کے سبب ان کے لیے نئے کپڑے نہ بنوا سکتے یا فیس دینے میں دیر ہو جاتی۔ یا ناشتا نہ مل سکتا۔ یا مدرسہ میں کچھ کھانے کے لیے پیسے نہ ملتے تو دونوں مائیں تلخ اور طعن آمیز باتوں سے ان کو چھید ڈالتی تھیں۔ بیکاری کے ایام میں وہ اکثر اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بیوی اور بچوں کو اپنی سسرال پہنا دیا کرتے تھے۔ غیرت کے سبب سے ایک آدھ مہینہ کے لیے بلا لیتے اور پھر کسی نہ کسی حیلہ سے رخصت کر دیتے۔ جب سے مسٹر جان سیوک کے یہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ جبھی سے گویا ان کے دن پھر گئے تھے۔ کل کی فکر سر پر سوار نہ رہتی تھی۔ ماہر علی کی عمر پندرہ سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اب ان کی ساری امیدیں اسی کی ذات سے وابستہ تھیں۔ سوچتے تھے" جب ماہر علی میٹرک ہو جائے گا تو صاحب سے سفارش کر کے پولیس میں بھرتی کرا دوں گا۔ تنخواہ

پچاس روپے ماہوار سے کیا کم ہوگی۔ ہم دونوں بھائیوں کی آمدنی مل کر اسی روپے ہو جائے گی۔ جبھی زندگی کا کچھ لطف ملے گا۔ اس وقت تک ظاہر علی بھی ہاتھ پیر سنبھال لے گا۔ پھر تو چین ہی چین ہے۔ بس تین چار برس کی تکلیف اور ہے۔'' بیوی سے اکثر جھگڑا ہو جاتا۔ وہ کہا کرتی۔ ''یہ بھائی بند ایک بھی تمہارے کام نہ آئیں گے۔ جوں ہی وقت آیا پرجھاڑ کر نکل جائیں گے۔ تم کھڑے تاکتے رہ جاؤ گے۔'' طاہر علی ان باتوں پر بیوی سے روٹھ جاتے۔ اسے گھر میں آگ لگانے والی بس کی گانٹھ کہہ کر رلاتے۔

امیدوں اور فکروں سے اتنا دبا ہوا شخص مسز سیبوک کی تلخ کلامی کا کیا جواب دیتا۔ آقا کے قہر نے خدا کے قہر کو مغلوب کر دیا۔ دکھ بھری آواز میں بولے۔ ''حضور کا نمک خوار ہوں۔ آپ کا حکم میرے لیے خدا کے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ کتابوں میں آقا کو خوش رکھنے کا وہی ثواب لکھا ہے جو خدا کو خوش رکھنے کا ہے۔ حضور کی نمک حرامی کر کے خدا کو کیا منہ دکھلاؤں گا؟''

جان سیبوک: ہاں۔ اب آپ آئے راہ راست پر۔ جائیے اپنا کام کیجیے۔ مذہب اور تجارت کو ایک ترازو میں تولنا ایک بیوقوفی ہے۔ مذہب مذہب ہے اور تجارت تجارت۔ ان میں کوئی باہمی تعلق نہیں۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے تجارت کی ضرورت ہے۔ مذہب کی نہیں۔ مذہب تو تجارت کا سنگار ہے۔ وہ دولت مندوں کے لیے ہی زیبا ہے۔ خدا آپ کو مقدرت دے۔ موقع ملے۔ گھر میں فاضل روپے ہوں تو نماز پڑھیے۔ حج کیجیے۔ مسجد بنوائیے۔ کنواں کھدوائیے۔ جبھی مذہب ہے۔ خالی پیٹ خدا کا نام لینا گناہ ہے۔

طاہر علی نے جھک کر سلام کیا اور گھر واپس گئے۔

(7)

شام ہوگئی تھی، لیکن پھاگن شروع ہو جانے پر بھی سردی سے ہاتھ پاؤں اکڑتے

تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بدن کی ہڈیوں میں چبھے جاتے تھے۔ جاڑا، بارش کی مدد پا کر پھر اپنی بکھری ہوئی طاقتوں کو مجتمع کر رہا تھا اور دل سے کوشاں تھا کہ موجودہ موسم کو پلٹ دے۔ بادل بھی تھے۔ بوندیں بھی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا بھی تھی۔ کہرا بھی تھا۔ ان مختلف طاقتوں کے مقابلہ میں موسم بہار کی ایک نہ چلتی تھی۔ لوگ لحاف میں اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھے جیسے چوہے بلوں میں سے جھانکتے ہوں۔ دکان دار انگیٹھیوں کے سامنے بیٹھے ہاتھ سینکتے تھے۔ پیسوں کے سودے نہیں، مروت کے سودے بیچتے تھے۔ راہ چلتے لوگ الاؤ پر یوں گرتے تھے جیسے شمع پر پروانے۔ بڑے گھروں کی عورتیں مناتی تھیں۔ مصرانی آئے، تو آج کھانا پکائیں۔ چولہے کے سامنے بیٹھنے کا موقع ملے۔ چائے کی دکانوں پر جمگھٹ رہتا تھا۔ ٹھاکر دین کے پاس چھبڑی میں پڑے سڑ رہے تھے۔ پر اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کو پھیرے۔ سورداس اپنی جگہ پر تو آ بیٹھا تھا۔ پر ادھر ادھر سے سوکھی ٹہنیاں اکٹھی کر کے جلا لی تھیں اور ہاتھ سینک رہا تھا۔ سواریاں آج کہاں۔ ہاں کوئی اکا دکا مسافر نکل جاتا تھا تو بیٹھے بیٹھے اس کا کلیان منا لیتا تھا۔ جب سے سید طاہر علی نے اسے دھمکیاں دی تھیں، زمین کے نکل جانے کا خوف اس پر سوار رہتا تھا۔ سوچتا۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے اس زمین کی اتنی حفاظت کی تھی، میرے دن سدا ایسے ہی تھوڑے رہیں گے۔ کبھی تو لچھمی خوش ہوں گی۔ اندھوں کی آنکھیں نہ کھلیں مگر نصیب تو کھل سکتے ہیں۔ کون جانے۔ کوئی دانی داتا مل جائے یا میرے ہی پاس دھیرے دھیرے کچھ روپے اکٹھے ہو جائیں۔ بنتے دیر نہیں لگتی۔ یہی خواہش تھی کہ یہاں ایک کنواں اور چھوٹا سا مندر بنوا دیتا تو مرنے کے پیچھے اپنی کچھ نشانی رہتی۔ نہیں تو کون جانے گا کہ اندھا کون تھا۔ پسنہاری نے کنواں کھدوایا تھا۔ آج تک اس کا نام چلا جاتا ہے۔ جھکڑ سائیں نے باؤلی بنوائی تھی، آج تک جھکڑ کی باؤلی مشہور ہے۔ زمین نکل گئی تو نام ڈوب جائے گا۔ کچھ روپے ملے بھی تو کس کام کے۔ نایک رام اسے ڈھارس

دیتا تھا۔ ''تم کچھ مت کرو۔ کون مائی کا لال ہے جو میرے رہتے تمہاری زمین نکال لے۔ لہو کی ندی بہا دوں گا۔ اس کرنٹے کی کیا مجال۔ گودام میں آگ لگا دوں گا۔ ادھر کا راستہ چھڑا دوں گا۔ وہ ہے کس گمان میں۔ بس تم حامی نہ بھرنا۔'' مگر ان الفاظ سے جو تشفی ہوتی تھی وہ بھیرو اور جگدھر کی حاسدانہ بحث سے مٹ جاتی تھی۔ اور وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر رہ جاتا تھا۔

وہ انہی خیالات میں محو تھا کہ نایک رام کندھے پر لٹھ رکھے اور ایک انگوچھا کندھے پر ڈالے پان کے بیڑے منہ میں بھرے وہاں آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''سورداس! بیٹھے ہی رہو گے۔ سانجھ ہو گئی۔ ہوا کھانے والے اب اس ٹھنڈ میں نہ نکلیں گے۔ کھانے بھر کو مل گیا کہ نہیں؟''

سورداس: کہاں مہاراج۔ آج تو ایک بھاگوان سے بھی بھینٹ نہ ہوئی۔

نایک رام: جو بھاگ میں تھا مل گیا۔ چلو گھر چلیں۔ بہت ٹھنڈ لگتی ہو تو میرا یہ انگوچھا کندھے پر ڈال لو۔ میں تو ادھر آیا تھا کہ کہیں صاحب مل جائیں تو دو دو باتیں کر لوں۔ پھر ایک بار اس کی اور ہماری بھی ہو جائے۔

سورداس چلنے کو اٹھا ہی تھا کہ دفعتاً ایک گاڑی کی آہٹ سنائی دی۔ رک گیا۔ آس بندھی۔ ایک لمحہ میں فٹن آ پہنچی۔ سورداس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''داتا بھگوان تمہارا کلیان کریں اندھے کی کھبر (خبر) لیجیے۔''

فٹن رک گئی اور چتاری کے راجہ صاحب اتر پڑے۔ نایک رام ان کا پنڈا تھا۔ سال میں دو چار سو روپے ان کی ریاست سے پاتا تھا۔ ان کو آشیرواد دے کر بولا۔ ''سرکار کا ادھر کیسے آنا ہوا؟ آج تو بڑی ٹھنڈ ہے۔''

راجہ صاحب: یہی سورداس ہے جس کی زمین آگے پڑتی ہے؟ آؤ تم دونوں آدمی میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا اس زمین کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

نایک رام: سرکار چلیں۔ ہم دونوں پیچھے پیچھے آتے ہیں۔

راجہ صاحب: اجی آ کر بیٹھ جاؤ۔ تمہیں آنے میں دیر ہو گی اور میں نے ابھی سندھیا نہیں کی ہے۔

سورداس: پنڈا جی! تم بیٹھ جاؤ۔ میں دوڑتا ہوا چلوں گا۔ گاڑی کے ساتھ ہی ساتھ پہنچوں گا۔

راجہ صاحب: نہیں نہیں۔ تمہارے بیٹھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ تم اس وقت بھکاری سورداس نہیں، زمیندار سورداس ہو۔

نا یک رام: بیٹھو سور بیٹھو۔ ہمارے سرکار ساکشات دیوتا سروپ ہیں۔

سورداس: پنڈا جی! میں.....

راجہ صاحب: پنڈا جی! تم ان کا ہاتھ پکڑ بٹھا دو۔ یوں نہ بیٹھیں گے۔

نا یک رام نے سورداس کو گود میں اٹھا کر گدی پر بٹھا دیا۔ آپ بھی بیٹھے اور فٹن روانہ ہوئی۔ سورداس کو اپنی زندگی میں فٹن پر سوار ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اڑا جا رہا ہوں۔ تین چار منٹ میں جب گودام پر گاڑی رک گئی اور راجہ صاحب اتر پڑے تو سورداس کو تعجب ہوا کہ اتنی جلد کیونکر آ گئے۔

راجہ صاحب: زمین تو بڑے موقع کی ہے۔

سورداس: سرکار! باپ دادوں کی نشانی ہے۔

سورداس کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ ''کیا صاحب نے ان کو یہ زمین دیکھنے کے لیے بھیجا ہے؟ سنا ہے یہ بڑے دھرماتما آدمی ہیں۔ تو انہوں نے صاحب کو سمجھا کیوں نہ دیا؟ بڑے آدمی سب ایک ہوتے ہیں۔ چاہے ہندو یا مسلمان۔ تبھی تو میرا اتنا آدر کر رہے ہیں۔ جیسے بکرے کی گردن کاٹنے سے پہلے اسے پیٹ بھر دانہ کھلا دیتے ہیں۔ لیکن میں ان کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔''

راجہ صاحب: اسامیوں کے ساتھ بندوبست ہے؟

نا یک رام: نہیں سرکار۔ ایسی ہی پرتی پڑی رہتی ہے۔ سارے محلّہ کی گائیں یہیں چرنے آتی ہیں۔ اٹھا دی جائے تو دوسو سے کم نفع نہ ہو، پر یہ کہتا ہے۔ اب بھگوان مجھے یونہی کھانے بھر کع دے دیتے ہیں تو اسے کیوں اٹھاؤں؟

راجہ صاحب: اچھا تو سورداس دان لیتا ہی نہیں۔ دیتا بھی ہے۔ ایسے لوگوں کے درشن ہی سے پن ہوتا ہے۔

نا یک رام کی نگاہ میں سورداس کی اتنی عزت کبھی نہ ہوئی تھی۔ بولے۔ ''حضور! اس جنم میں کوئی بڑا بھاری مہاتما ہے۔''

راجہ صاحب: اس جنم کا نہیں، اس جنم کا مہاتما ہے۔

سچا سخی شہرت کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ سورداس کو اپنی قربانی اور سخاوت کی اہمیت کا علم ہی نہ تھا۔ شاید ہوتا تو مزاج میں اتنی سادگی اور عاجزی نہ رہتی بلکہ اپنی تعریف کانوں کو اچھی لگتی۔ مہذب نگاہوں میں سخاوت کا یہی بہترین انعام ہے۔ سورداس کا دان زمیں یا آسمان کا دان تھا۔ جسے تعریف یا شہرت کی فکر نہیں ہوتی۔ اس کو راجہ صاحب کی فیاضی میں فریب کا شائبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بےقرار ہو رہا تھا کہ راجہ صاحب کا ان باتوں سے مطلب کیا ہے؟

نا یک رام، راجہ صاحب کو خوش کرنے کے لیے سورداس کی تعریف کرنے لگے۔ ''دھرم اوتار! اتنے پر بھی انہیں چین نہیں ہے۔ یہاں دھرم شالا، مندر اور کنواں بنوانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔''

راجہ صاحب: واہ پھر تو بات ہی بن گئی۔ کیوں سورداس! تم اس زمین سے نو بیگھے مسٹر جان سیوک کو دے دو۔ ان سے جو روپے ملیں۔ انہیں دھرم کاج میں لگا دو۔ اس طرح تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور صاحب کا کام بھی نکل جائے گا۔ دوسروں سے اتنے اچھے دام نہ ملیں گے۔ بولو کتنے روپے دلا دوں۔

نا یک رام سورداس کو خاموش دیکھ کر ڈر گئے کہ کہیں یہ انکار کر بیٹھا تو میری بات

گئی۔ بولے۔ ''سورداس! ہمارے مالک کو جانتے ہو نا؟ چتاری کے مہاراجہ ہیں۔ اسی دربار سے ہماری پرورش ہوتی ہے۔ میونسپلٹی کے سب سے بڑے حاکم ہیں۔ آپ کے حکم بنا کوئی اپنے دروازے پر کھونٹا بھی نہیں گاڑ سکتا۔ چاہیں تو سب یکہ بانوں کو پکڑ ڈالیں۔ سارے شہر کا پانی بند کر دیں۔''

سورداس: جب آپ کو اتنا بڑا اختیار ہے تو صاحب کو کوئی دوسری زمین کیوں نہیں دلا دیتے؟

راجہ صاحب: ایسے اچھے موقع پر شہر میں دوسری زمین ملنی مشکل ہے، لیکن تمہیں اس کے دینے میں کیا قباحت ہے۔ اس طرح تو نہ جانے کتنے دنوں میں تمہاری آرزوئیں پوری ہوں گی۔ یہ تو بہت اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ روپے لے کر دھرم کاج میں لگا دو۔

سورداس: مہاراج! میں خوشی سے اپنے زمین نہ بیچوں گا۔

نائیک رام: سورداس! کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟ کچھ خیال ہے۔ کس سے باتیں کر رہے ہو؟

سورداس: پنڈا جی! سب خیال ہے۔ انکھیں نہیں ہیں تو کیا بدھی (عقل) بھی نہیں ہے؟ پر جب میری چیز ہے ہی نہیں تو میں اس کا بیچنے والا کون ہوں۔

راجہ صاحب: یہ زمین تو تمہاری ہی ہے؟

سورداس: نہیں سرکار! میری نہیں۔ میری باپ دادوں کی ہے۔ میری چیز وہی ہے جو میں نے اپنے بانہہ بل (ہاتھوں کی مشقت) سے پیدا کی ہو۔ یہ زمین مجھے میرے دھروہر (امانت) ملی ہے۔ میں اس کا مالک نہیں ہوں۔

راجہ صاحب: سورداس! تمہاری یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اگر اور زمینداروں کے دل میں ایسے ہی خیالات ہوتے تو آج سینکڑوں گھر اس طرح تباہ نہ ہوتے۔ صرف عیش وعشرت کے لیے لوگ بڑی بڑی ریاستیں برباد کر دیتے ہیں۔

پنڈا جی! میں نے کونسل میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ زمینداروں کو اپنی جائداد بیچنے کا اختیار نہیں ہے، لیکن جو جائیداد دھرم کاج کے لیے بیچی جائے اس کو میں بیچنا نہیں کہتا۔

سورداس: دھرم اوتار! میرا تو اس زمین کے ساتھ اتنا ہی ناتا ہے کہ جب تک جیوں، اس کی حفاظت کروں اور مروں تو اسے جوں کا توں چھوڑ جاؤں۔

راجہ صاحب: لیکن یہ تو سوچو کہ تم اپنی زمین کا ایک حصہ صرف اس لیے دوسرے کو دے رہے ہو کہ مندر وغیرہ بنوانے کے لیے روپے مل جائیں۔

نائیک رام: بولو۔ سورداس۔ مہاراج کی اس بات کا کیا جواب دیتے ہو؟

سورداس: میں سرکار کی باتوں کا جواب دینے جوگ (لائق) ہوں کہ جواب دوں۔ مگر اتنا تو سرکار جانتے ہی ہیں کہ لوگ انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑ لیتے ہیں۔ صاحب پہلے تو نہ بولیں گے۔ پھر دھیرے دھیرے احاطہ بنالیں گے۔ کوئی مندر میں جانے نہ پائے گا۔ ان سے کون روز روز لڑائی کرے گا؟

نائیک رام: مہاراج! سورداس نے یہ بات پکی کہی۔ بڑے آدمیوں سے کون لڑتا پھرے گا۔

راجہ صاحب: صاحب کیا کریں گے؟ کیا تمہارا مندر کھود کر پھینک دیں گے؟

نائیک رام: بولو سورداس اب کیا کہتے ہو؟

سورداس: سرکار! غریب کی گھر والی گاؤں کی بھاوج ہوتی ہے۔ صاحب کرسٹان ہیں۔ دھرم شالہ میں تمباکو کا گودام بنائیں گے۔ مندر میں ان کے مجور (مزدور) سوئیں گے۔ کنوئیں پر ان کے مجوروں کا اڈا ہوگا۔ بہو بیٹیاں پانی بھرنے نہ جاسکیں گی۔ صاحب نہ کریں گے تو صاحب کے لڑکے کریں گے۔ میرے باپ دادوں کا نام ڈوب جائے گا۔ ناسرکار! مجھے اس دلدل میں نہ پھنسائیے۔

نائیک رام: دھرم اوتار! سورداس کی بات میرے من میں بھی بیٹھی ہے۔ تھوڑے

دنوں میں مندر، دھرم شالا، کنواں سب صاحب کا ہو جائے گا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔

راجہ صاحب: اچھا۔ یہ بھی مانا، لیکن ذرا یہ بھی سوچو کہ اس کارخانہ سے لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا۔ ہزاروں مزدور، مستری، بابو، منشی، لوہار، بڑھئی آ کر آباد ہو جائیں گے۔ ایک اچھی بستی ہو جائے گی۔ بنیوں کی نئی نئی دکانیں کھل جائیں گی۔ آس پاس کے کسانوں کو اپنی ساگ بھاجی لے کر شہر نہ جانا پڑے گا۔ یہیں کھڑے دام مل جائیں گے۔ کنجڑے، گوالے، دھوبی، درزی، سبھی کو فائدہ ہوگا۔ کیا اس کا ثواب تم کو نہ ہوگا؟

نائیک رام: اب بولو۔ سورداس! اب تو کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہمارے سرکار کی بھل منسی ہے کہ تم سے اتنی دلیلیں کر رہے ہیں۔ دوسرا حاکم ہوتا تو ایک حکم نامہ میں ساری زمین تمہارے ہاتھ سے نکل جاتی۔

سورداس: اس لیے تو لوگ چاہتے ہیں کہ حاکم دھرماتما ہوں۔ نہیں تو کیا دیکھتے نہیں ہیں کہ حاکم لوگ بنا ڈام فول، سور کے بات نہیں کرتے۔ ان کے سامنے کھڑے نہ ہونے کا تو ہیاؤ ہی نہیں ہوتا۔ باتیں کون کرتا؟ اس لیے تو مناتے ہیں کہ ہمارے راجوں مہاراجوں کا راج ہوتا جو ہمارا دکھ درد سنتے۔ سرکار بہت ٹھیک کہتے ہیں۔ محلّہ کی رونق ضرور بڑھے گی۔ روزگاری سے لوگوں کو فائدہ بھی خوب ہوگا، لیکن جہاں یہ رونق ہوگی وہاں تاڑی شراب کا بھی تو پرچار بڑھ جائے گا۔ کسبیاں بھی تو آ کر بس جائیں گی۔ پردیسی آدمی ہماری بہو بیٹیوں کو گھوریں گے۔ کتنا ادھرم ہوگا؟ دیہات کے کسان اپنا کام چھوڑ کر مجوری کی لالچ سے دوڑیں گے۔ یہاں بری بری باتیں سیکھیں گے اور اپنے برے اچرن (چال چلن) اپنے گاؤں میں پھیلائیں گے۔ دیہاتوں کی بیٹیاں بہوئیں مجوری کرنے آئیں گی۔ اور یہاں پیسے کے لوبھ میں اپنا دھرم بگاڑیں گی۔ جو رونق شہروں میں ہے، وہی رونق یہاں ہو جائے گی۔ بھگوان نہ کریں یہاں وہ بات ہو۔ سرکار مجھے اس کو کرم اور ادھرم سے

بچائیں۔ یہ سارا پاپ میرے سر پڑے گا۔

نا یک رام: دین بندھو! سورداس بہت سچی بات کہتا ہے۔ کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، کان پور آپ کے اکبال (اقبال) سے سبھی جگہ گھوم آیا ہوں۔ ججمان لوگ بلاتے رہتے ہیں۔ جہاں جہاں کل کارخانے ہیں، وہاں وہاں یہی حال دیکھا ہے۔

راجہ صاحب: کیا یہ برائیاں تیرتھ کے مقاموں میں نہیں ہیں؟

سورداس: سرکار! ان کا سدھار بھی تو بڑے آدمیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں بری باتیں پہلے ہی سے ہیں، وہاں سے ہٹانے کے بدلے انہیں اور پھیلانا تو مناسب نہیں۔

راجہ صاحب: ٹھیک کہتے ہو۔ سورداس! بہت ٹھیک کہتے ہو۔ تم جیتے۔ میں ہار گیا۔ تمہاری باتوں سے طبیعت خوش ہوگئی۔ کبھی شہر آنا تو میرے یہاں ضرور آنا۔ جس وقت میں نے صاحب سے اس زمین کے طے کرا دینے کا وعدہ کیا تھا، یہ باتیں میرے دھیان میں نہ آئی تھیں۔ اب تم خاطر جمع رکھو۔ میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ سورداس زمین نہیں دیتا۔ نا یک رام! دیکھو۔ سورداس کو کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہ لو سورداس! یہ تمہارے اتنے دور آنے کی مزدوری ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے ایک روپیہ سورداس کے ہاتھ پر رکھا اور چل دیئے۔ نا یک رام نے کہا: ''سورداس! اب راجہ صاحب بھی تمہاری کھوپڑی کو مان گئے۔''

(8)

صوفیہ کو اندو کے ساتھ رہتے چار مہینے گزر گئے۔ اپنے گھر اور گھر والوں کی یاد آتے ہی اس کے دل میں ایک آگ سی جل اٹھتی تھی۔ پربھو سیوک روزانہ ایک بار اس سے ملنے آیا کرتا، پر کبھی اس سے گھر کے حالات نہ پوچھتی۔ وہ کبھی ہوا کھانے بھی نہ جاتی کہ کہیں ماما سے سامنا نہ ہو جائے۔ اگرچہ اندو نے اس کے ذاتی حالات

کو سب سے مخفی رکھا تھا لیکن قیاس سے سبھی اس کے حالات سے واقف ہو گئے تھے۔ اس لیے ہر شخص کو یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو اس کو ناگوار ہو۔ اندو کو تو اس سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ زیادہ تر اسی کے پاس بیٹھی رہتی۔ اس کی صحبت سے اندو کو بھی مذہب اور فلسفہ کی کتابوں سے رغبت ہونے لگی تھی۔

گھر ٹپکتا ہو تو اس کی مرمت کی جاتی ہے۔ گر جائے، اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ صوفی کو جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ میری ساری باتیں جان گئے، تو اس نے پردہ رکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ مذہبی کتب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئی۔ پرانی کدورتیں دل سے مٹنے لگیں۔ ماں کی دل خراش باتوں کا زخم مندمل ہونے لگا۔ وہ تنگ خیالی جو ذاتی جذبات اور خیالات کو نامناسب اہمیت دے دیتی ہے، اس کو اشاعت اور اخلاق کے دائرہ میں آ کر سچ معلوم ہونے لگی۔ دل نے کہا یہ ماما کا قصور نہیں بلکہ ان کی مذہبی تنگ خیالی کا قصور ہے۔ ان کے خیال کا دائرہ محدود ہے۔ ان میں آزاد خیالی کا احترام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ان سے میں ناحق ناراض ہو رہی ہوں۔ یہی ایک کانٹا تھا جو اس کے دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا۔ جب وہ نکل گیا تو دل کو سکون ہو گیا۔ اس کا وقت مذہبی کتب کے مطالعہ اور مذہبی اصولوں کی تحقیقات میں گزرنے لگا۔ انہماک، درد دل کا بہترین علاج ہے۔

لیکن اس مطالعہ اور تحقیقات سے اس کے دل کو قرار آ جاتا ہو، یہ بات نہ تھی۔ طرح طرح کے شکوک ہر روز پیدا ہوتے رہتے تھے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہر مذہب میں اس کا جدا جدا جواب ملتا تھا، لیکن ایک بھی ایسا نہیں ملا جس کو دل قبول کرے۔ معجزات کیا ہیں؟ کیا صرف عقیدت مندوں کی فرضی باتیں ہیں۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ عبادت کا مقصد کیا ہے؟ خدا کیوں انسانوں سے اپنی عبادت کے لیے کہتا ہے؟ اس سے اس کی منشا کیا ہے؟ کیا وہ اپنی ہی خلقت سے اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔ وہ ان سوالوں پر غور کرنے میں اس قدر محو رہتی کہ کئی کئی روز کمرہ

سے باہر نہ نکلتی۔ کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اندو کا آنا اسے برا معلوم ہوتا۔

ایک روز صبح کے وقت وہ کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اندو آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ صوفیہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوئی۔ حسب سابق مطالعہ میں مصروف رہی۔ اندو بولی۔ ''صوفی! اب یہاں دو چار دن کی اور مہمان ہوں۔ مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟''

صوفی نے سر اٹھائے بغیر ہی کہا۔ ''ہاں!''۔

اندو: تمہارا دل تو اپنی کتابوں میں بہل جائے گا۔ میری یاد بھی نہ آئے گی۔ پر مجھ سے تمہارے بغیر ایک دن بھی نہ رہا جائے گا۔

صوفی نے کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

اندو: پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ سارا دن پڑے پڑے سوچا کروں گی۔

صوفی نے کتاب کا ورق الٹتے ہوئے کہا۔ ''ہاں''۔

اب اندو، صوفیہ کی اس سرد مہری کو برداشت نہ کر سکی۔ کسی دوسرے وقت وہ ناراض ہو کر چلی جاتی یا اس کو مطالعہ میں محو دیکھ کر کمرہ میں قدم ہی نہ رکھتی لیکن اس وقت اس کا ملائم دل جدائی کے درد سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں روٹھنے کے خیال کی گنجائش نہ تھی۔ رو کر بولی۔ ''بہن! ایشور کے لیے ذرا کتاب بند کر دو۔ میں چلی جاؤں گی تو پھر خوب پڑھ لینا۔ وہاں سے تمہیں چھیڑنے نہ آؤں گی۔''

صوفی نے اندو کی طرف دیکھا۔ گویا مراقبہ سے بیدار ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ چہرہ اداس تھا اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بولی ''ارے اندو! کیا بات ہے؟ روتی کیوں ہو؟''

اندو: تم اپنی کتاب پڑھو۔ تمہیں کسی کے رونے دھونے کی کیا پروا ہے؟ ایشور نے نہ جانے کیوں تمہارے جیسا دل مجھ کو نہیں دیا۔

صوفیہ: بہن! معاف کرنا! میں ایک بڑی الجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ ابھی تک وہ گتھی نہیں سلجھی۔ میں بت پرستی کو بالکل لغو خیال کرتی تھی۔ میں سمجھتی کہ رشیوں نے صرف جہلاء کی روحانی تسکین کے لیے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے، لیکن اس کتاب میں بت پرستی کا جواز ایسے عالمانہ دلائل کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ آج میں مورتی پوجا کی قائل ہوگئی۔ مصنف نے اس کو سائنٹیفک طریقہ پر ثابت کیا ہے۔ یہاں تک کہ مورتوں کی بناوٹ اور دکھاوٹ کو بھی انہیں طریقوں پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔

اندو: میرے لیے بلاوا آ گیا۔ آج کے تیسرے دن چلی جاؤں گی۔

صوفیہ: یہ تو تم نے بری خبر سنائی۔ پھر میں یہاں کیسے رہوں گی؟

اس جملہ میں ہمدردی نہیں بلکہ خودغرضی تھی لیکن اندو نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ صوفی کے لیے میری جدائی نا قابل برداشت ہوگی۔ بولی۔ ''تمہارا جی تو کتابوں میں بہل جائے گا۔ میں البتہ تمہاری یاد میں تڑپا کروں گی۔ سچ جانو تمہاری صورت ایک لمحہ کے لیے بھی خیال سے نہ ہٹے گی۔ یہ موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھرا کرے گی۔ بہن اگر تمہیں برا نہ لگے تو ایک استدعا کروں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم بھی کچھ دن میرے ساتھ رہو؟ تمہاری صحبت سے میری زندگی بھی سدھر جائے گی۔ میں اس کے لیے ہمیشہ تمہاری ممنون رہوں گی۔''

صوفیہ: تمہاری محبت کی اسیر ہوں۔ جہاں چاہو لے چلو۔ چاہوں تو جاؤں گی۔ نہ چاہوں تو نہ جاؤں گی۔ مگر یہ تو بتاؤ تم نے راجہ صاحب سے بھی پوچھ لیا ہے۔

اندو: یہ ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے ان کی صلاح لینی پڑے۔ مجھ سے برابر کہتے رہتے ہیں کہ تمہارے لیے ایک ایڈی کی ضرورت ہے۔ اکیلے تمہارا جی گھبراتا ہوگا۔ یہ تجویز سن کر خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔

رانی جانہوی تو اندو کے رخصت کی تیاریاں کر رہی تھیں اور اندو صوفیہ کے لیے لیس اور کپڑے لا لا کر رکھتی تھی۔ انواع و اقسام کی پوششوں سے کئی صندوق بھر

دیئے۔وہ اسے ایسے ٹھاٹ سے لے جانا چاہتی تھی کہ گھر کی لونڈیاں باندیاں اس کی مناسب احترام کریں۔ پر بھوسیوک کو صوفیہ کا اندو کے ساتھ جانا اچھا نہ لگتا تھا۔اس کو اب بھی امید تھی کہ ماما کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ صوفی کو گلے لگائیں گی۔ صوفی کے چلے جانے سے مغائرت کا بڑھنا یقینی امر تھا۔اس نے صوفیہ کو سمجھایا،لیکن وہ اندو کی تجویز کو نامنظور نہ کرنا چاہتی تھی۔اس نے عہد کرلیا کہ اب گھر نہ جاؤں گی۔

تیسرے روز راجہ مہیندر کمار، اندو کو رخصت کرانے آئے،تو اندو نے اور باتوں کے ساتھ صوفی کو ساتھ لے چلنے کا تذکرہ چھیڑ دیا۔بولی۔''میرا جی وہاں اکیلے گھبرایا کرتا ہے۔مس صوفیہ کے رہنے سے میرا جی بہل جائے گا۔''

مہیندر: کیا مس سیوک ابھی تک یہیں ہیں؟

اندو: بات یہ ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں آزادخیالی چاہتی ہیں اور ان کے گھر والے اس آزادخیالی کو برداشت نہیں کر سکتے۔اسی وجہ سے وہ اپنے گھر نہیں جانا چاہتیں۔

مہیندر: لیکن یہ تو سوچو کہ ان کے میری یہاں رہنے سے میری کتنی بدنامی ہوگی۔ مسٹر سیوک کو یہ بات بری لگے گی اور یہ بالکل غیر مناسب ہے کہ میں ان کی لڑکی کو ان کی مرضی کے بغیر اپنے گھر میں رکھوں۔اس میں سراسر بدنامی ہوگی۔

اندو: مجھے تو اس میں بدنامی کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔کیا سہیلی اپنی سہیلی کے یہاں مہمان نہیں ہوتی۔صوفی کا مزاج بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ ادھر ادھر گھومنے لگے گی۔

مہیندر: وہ دیوی سہی لیکن ایسے کتنے ہی وجوہ ہیں کہ میں ان کا تمہارے ساتھ جانا نامناسب سمجھتا ہوں۔تم میں یہ بڑا عیب ہے کہ تم کسی کام کو کرنے سے پہلے اس پر غور کرلینا ٹھیک نہیں سمجھتیں۔کیا تمہاری رائے میں خاندانی رواج کی مخالفت کرنے میں کوئی برائی نہیں؟ ان کے گھر والے یہی تو چاہتے ہیں کہ وہ ظاہراً طریقہ پر اپنے

مذہبی احکام کی پابندی کریں۔ اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکتیں تو میں یہی کہوں گا کہ ان کی آزاد خیالی موزونیت کی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر گئی ہے۔

اندو: لیکن میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں۔ میں کئی دن سے انہیں تیاریوں میں مصروف ہوں۔ یہاں اماں جی سے اجازت لے چکی ہوں۔ گھر کے سبھی لوگ نوکر چاکر جانتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ جا رہی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں ان کو نہ لے گئی تو لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ سوچیے اس میں میری کتنی رسوائی ہو گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔

مہیندر: بدنامی سے بچنے کے لیے سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں مس سیوک سے کہتے شرم آتی ہو تو میں کہہ دوں۔ وہ اتنی نادان نہیں ہیں کہ اتنی موٹی سی بات نہ سمجھیں۔

اندو: مجھے ان کے ساتھ رہتے رہتے ان سے اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ ان سے ایک دن بھی علیحدہ رہنا مجھے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تو خیر پروا نہیں۔ جانتی ہوں۔ کبھی نہ کبھی ان سے جدائی ہو گی ہی۔ اس وقت سب سے زیادہ فکر مجھے اپنی سبکی کی ہے۔ لوگ کہیں گے۔ بات کہہ کر پلٹ گئی۔ صوفی نے پہلے صاف انکار کر دیا تھا۔ میرے بہت کہنے سننے پر راضی ہوئی تھی۔ آپ میری خاطر سے اب کے میری یہ استدعا قبول کیجیے۔ پھر میں آپ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کروں گی۔

مہیندر کمار کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اندو روئی۔ اس نے منت سماجت کی۔ وہ پیروں پڑی۔ اس نے وہ سبھی منتر پھونکے جو کبھی بے اثر نہیں ہوتے لیکن شوہر کا پتھر کا دل نہ پسیجا۔ ان کو اپنا نام دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز تھا۔

جب مہیندر کمار باہر چلے گئے تو اندو بہت دیر تک حالت غم میں بیٹھی رہی۔ بار بار یہی خیال آتا۔ صوفی اپنے دل میں کیا کہے گی۔ میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ میرے سوامی میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اب وہ سمجھے گی کہ وہ اس کی بات بھی نہیں

پوچھتے۔ بات بھی ایسی ہی ہے۔ انہیں میری کیا پروا ہے؟ باتیں ایسی کریں گے گویا ان سے زیادہ فیاض طبع دنیا میں کوئی شخص نہیں ہے۔ پر وہ سب کوری بکواس ہے۔ انہیں تو یہی منظور ہے کہ یہ دن بھر تنہا بیٹھی اپنے نام کو رویا کرے۔ دل میں جلتے ہوں گے کہ صوفی کے ساتھ اس کے دن بھی آرام سے کٹیں گے۔ مجھے قیدیوں کی طرح رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں ضد کرنا آتا ہے تو میں کیا ضد نہیں کر سکتی۔ میں بھی کہے دیتی ہوں۔ آپ صوفی کو نہ چلنے دیں گے تو میں بھی نہ جاؤں گی۔ میرا کر ہی کیا سکتے ہیں! کچھ نہیں۔ دل میں ڈرتے ہیں کہ صوفی کے جانے سے گھر کا خرچ بڑھ جائے گا۔ خسیس تو ہیں ہی۔ اس خست کو چھپانے کے لیے بدنامی کا بہانہ نکالا ہے۔ دل غمگین ہو کر دوسروں کی نیک نیتی پر شک کرنے لگتا ہے۔

شام کے وقت جانہوی سیر کرنے چلی تو اندو نے اس سے یہ باتیں کہیں اور اصرار کیا کہ تم مہیندر کو سمجھا کر صوفی کو لے جانے پر راضی کر دو۔ جانہوی نے کہا ''تمہیں کیوں نہیں مان جاتیں؟''

اندو: اماں! میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں۔ میں ضد نہیں کرتی۔ اگر میں نے پہلے ہی صوفیہ سے نہ کہہ دیا ہوتا تو مجھے ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ پر ساری تیاریاں کر کے اب اس کو نہ لے جاؤں تو وہ اپنے دل میں کیا کہے گی۔ میں اس کو منہ نہیں دکھا سکتی۔ یہ اتنی چھوٹی سی بات ہے کہ اگر میرا ذرا بھی خیال ہوتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ ایسی حالت میں آپ کیونکر امید کر سکتی ہیں کہ میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کروں؟

جانہوی: وہ تمہارے سوامی ہیں۔ ان کی سبھی باتیں تمہیں ماننی پڑیں گی۔

اندو: خواہ وہ میری ذرا ذرا سی باتیں بھی نہ مانیں؟

جانہوی: ہاں انہیں اس کا اختیار ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میری نصیحتوں کا تمہارے اوپر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ میں تم کو شوہر پرست ستی دیکھنا چاہتی ہوں جسے اپنے شوہر کے حکم یا مرضی کے سامنے اپنی عزت یا ذلت کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ اگر وہ